کمرشل انٹرسٹ اور اسلام

از

(صاحبزادہ محمد امیر حمزہ شاکی صاحب)

ربوٰ کی حرمت کے متعلق قرآن و سنت کے احکام اس قدر واضح، موکد اور اشتباہ و ابہام سے بالا ہیں کہ اس کی ہر صورت کے حرام ہونے پر تیرہ صدی تک علمائے امت میں کامل اتفاق رہا ہے۔ لیکن گذشتہ تقریباً ایک سو سال کے عرصے میں بعض حضرات نے از سر نو اس مسئلے کو معرض بحث میں لانے کی کوشش کی ہے۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ تجارتی سود دراصل ربوٰ کی تعریف ہی میں نہیں آتا۔ اس لیے اس کی حلت یا حرمت کے مسئلے کو طے شدہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ زمانے کے حالات کے پیش نظر اس مسئلے پر اجتہاد کیا جائے اور عصر حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ بنکنگ اور تجارت کے سود کی حلت کا حکم لگایا جائے۔ اس لیے اب اس مسئلے نے یہ صورت اختیار کر لی ہے کہ ربوٰ کی صحیح تعریف اور اس کے اطلاق کی ٹھیک ٹھیک حدود بجائے خود زیر بحث آگئی ہیں۔ سرسید علیہ الرحمہ کے وقت سے جو کچھ اس مسئلے پر لکھا گیا ہے وہ اس مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم حضرات کے سامنے ہے۔ حال ہی میں ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے اس مسئلے کو پھر سے اٹھایا ہے اور اس پر ایک سیمنار منعقد کیا ہے[1]۔ ایک لحاظ سے ادارے کا یہ اقدام نہایت بروقت ہے۔ یہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ تقسیم ملک سے پہلے جو کچھ اس سوال پر لکھا گیا تھا وہ اس پس منظر کے ساتھ لکھا گیا تھا کہ ہم ایک غیر قوم کی غلامی میں تھے اور سیاسی غلبے کے علاوہ حاکم قوم کے تمدن و ثقافت

---

[1] ادارہ اپنے انعقاد کی رائے سیمنار کے انعقاد سے پہلے کتابی صورت میں شائع کر چکا ہے جس کے تینوں مقالہ نگار بد قسمتی سے اس امر پر متفق ہیں کہ کمرشل انٹرسٹ کو جائز قرار دیئے بغیر چارہ نہیں۔ ملاحظہ ہو: "کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت" مرتبہ جعفر شاہ صاحب پھلواری، شائع کردہ ثقافت اسلامیہ لاہور

نے بھی ہمارے قلب و دماغ پر استیلاء حاصل کر لیا تھا۔ اب جب کہ ہم بفضلِ خدا آزادی حاصل کر چکے ہیں اور حکومت اور عوام دونوں اس فکر میں ہیں کہ اپنے قوانین کی عمارت اسلام کی اساس پر قائم کریں تو اس سے زیادہ اور کیا مناسب ہو سکتا ہے کہ ہم اس مسئلے پر بھی اپنی بازیافتہ آزادی، اپنے مذہب، اپنی گذشتہ روایات اور مستقبل کے لیے اپنی آرزوؤں کے سیاق میں از سرِ نو غور کریں۔

اس مسئلے کی سائنٹفک تحقیق میں علمی و منطقی بحث شروع کرنے سے پہلے ہمارے خیال میں ایک نفسیاتی عامل کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے جو خفیہ طور پر برسرِ کار رہتا ہے۔ اس لیے ہم سب سے پہلے اس نفسیاتی پس منظر کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں جو سود کی موافقت میں لکھنے والے تقریباً سب اہلِ قلم اصحاب میں مشترک ہے۔ جس کسی نے ان حضرات کی تحریریں پڑھی ہیں وہ ذرا سے غور سے محسوس کر لے گا کہ یہ سب حضرات موجودہ صورتِ حالات کے پیشِ نظر ایک گونہ بے بسی کے احساس سے کلیۃً مغلوب ہیں ان سب کے دلوں میں یہ یقین یکساں طور پر جاگزیں ہے کہ موجودہ زمانے میں تجارت کو بنکوں کے وجود سے جو سہولتیں میسر ہیں وہ کمرشل انٹرسٹ کو جائز سمجھے بغیر کسی صورت حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر ان سہولتوں سے ہم دست بردار ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ یہ انفرادی اور قومی خودکشی کے مترادف ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں موجودہ متمدن زندگی میں انفرادی سہولتوں کا نظام، تجارتی کاروبار اور ملکی معاملات بنک کاری کے بغیر ناممکن ہیں اور بنک کاری کم از کم کمرشل انٹرسٹ کو جائز قرار دیئے بغیر ناممکن ہے۔ یہ خیال مختلف وجوہ سے بالعموم ہمارے دلوں میں ایسی جڑ پکڑ گیا ہے کہ اس نے ایک عُقدۂ نفسی (COMPLEX) کی صورت اختیار کر لی ہے جو ہمارے تحت الشعور میں پوشیدہ رہتا ہے اور وہیں سے ہماری تمام منطق کو متاثر کرتا ہے۔ جب تک ہمارے قلب کی گہرائیوں میں یہ یقین کارفرما ہے۔ ہم سوا اس کے اور کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر ہمیں اسلام بھی عزیز ہے اور ہمیں بطور ایک متمدن قوم زندہ رہنا بھی منظور ہے تو ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اپنے اسلام میں کوئی نہ کوئی راہ ایسی نکالیں کہ کمرشل انٹرسٹ حلال ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہمیں مسئلے کی آزادانہ تحقیق کرنا ہے تو یکسر لازمی ہے کہ ہم اس عُقدۂ نفسی کا سراغ اس

کی آخری کمین گاہ تک لگائیں اور اس سے نجات حاصل کر کے رہیں ۔

اگر ہم زمامِ فکر اس تعصب کے ہاتھوں سے لے کر تحقیقِ حق کے ہاتھوں میں دینے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمارا رویہ یہ نہ ہوگا کہ کسی نہ کسی طرح اسلام میں کمرشل انٹرسٹ کے جواز کی صورت نکال لی جائے۔ بلکہ ہم غیر جانبدارانہ اور سائنٹفک سپرٹ میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ حرمت ربوا کے اسلامی احکام کے الفاظ اور ان کی روح بغیر کسی توڑ مروڑ کے کمرشل انٹرسٹ کے جواز کی گنجائش چھوڑتے ہیں یا نہیں۔ اگر ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ احکام حرمت میں کمرشل انٹرسٹ بھی شامل ہے تو ہم بلا کسی چون و چرا یا دل گرفتگی کے اس فیصلے کے پابند ہو جائیں گے اور اس مسئلے کے متبادل اسلامی حل کی جانب متوجہ ہو جائیں گے ۔

اس غلط خیال کے اثر کو کلی طور پر اپنے ذہن سے خارج کرنے کے لیے ہمارے خیال میں کم از کم دو باتوں کا احساس کر لینا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ متمدن زندگی کے لیے جو بات لازمی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ زندگی کے معاملات میں جو ضروریات اور مشکلات پیش آتی ہیں ان کو پورا کرنے اور حل کرنے کی کوئی نہ کوئی قابل عمل اور تسلی بخش صورت نکالی جائے، نہ یہ کہ ان مشکلات کا جو حل غیر اسلامی نظاموں نے پیش کیا ہو وہی من و عن اختیار کر لیا جائے خواہ وہ اسلامی احکام کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ اصل ضرورت ایک مریض کے مرض کا ازالہ ہے نہ کہ اس کے کسی مخصوص نسخہ کا پابند ہونا خواہ وہ حرام ادویہ پر ہی مشتمل ہو۔ آج اگر ایک مرض کا علاج مثلاً شراب سے کیا جاتا ہے تو ضرورت یہ نہیں جو حلال دوا میسر آسکتی ہے اُسے چھوڑ کر شراب ہی کو حلال قرار دینے پر زور دیا جائے۔ یعنی دراصل اس مرض کا علاج دریافت کرنا متمدن زندگی کے لیے ناگزیر ہے نہ کہ شراب ہی کا جواز ڈھونڈنا ۔

دوسرے ہمیں اس بات کا پورے طور پر یقین ہونا چاہیے کہ متبادل حل ممکن بھی ہے اور قابل عمل بھی۔ خوش قسمتی سے موجودہ بنک کاری کی سہولتوں کی متبادل صورت کو ایجاد کرنے کا بار بھی ہم پر نہیں [illegible] متبادل اسلامی [illegible] بڑی حد تک بروئے کار بھی آ چکا ہے۔ ہمیں [illegible]

اس میں بعض اضافوں یا ترمیموں کی ضرورت پیش آئے۔

ماضی کی اسلامی تاریخ پر ایک غائر نظر آپ کو یقین دلا سکتی ہے کہ موجودہ بنک کاری کی تقریباً سبھی سہولتیں آغازِ اسلام ہی سے حاصل رہ چکی ہیں۔ ڈیپازٹ کا طریقہ، چیکوں کے ذریعہ سے ادائیگی، ایک شہر سے دوسرے شہروں میں ترسیل زر، ڈرافٹ، ملکی اور تجارتی اغراض کے لیے کثیر رقموں کی فراہمی ان سب کا انتظام موجود تھا۔ جس کی تفصیلات تاریخ میں ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ (آپ کے لیے دلچسپی کا موجب ہوگا اگر میں ذکر کردوں کہ) خود لفظ چیک ایک عربی لفظ "صک" کی مغربی صورت ہے جو عربوں میں ایک قسم کی ہنڈی کے لیے مستعمل تھا۔ یہ طریقہ بھی اور یہ لفظ بھی سپین کی وساطت سے یورپ کے دوسرے ملکوں میں پہنچا اور اب دنیا بھر میں رائج ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کے ایک ایسے ہی "صک" کی عبارت بھی دستیاب ہوئی ہے جس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آج بھی چیک کی عبارت اس سے کچھ مختلف نہیں۔ قصہ مختصر مسلمانوں میں صیرفہ (MONEY CHANGING) جیسا یعنی بنکنگ [illegible] موجودہ بنکنگ کے ایک ایک [illegible] (OPERATIONS) [illegible] اس کی متبادل جائز صورت متعین کی جا سکتی ہے جو کاروبار قابلِ عمل ہو۔

اپنے دامنِ خیال کو گردِ تعصب سے اس طرح پاک کر لینے کے بعد ہم ربوٰا کی تعریف متعین کرنے کے لیے غیر جانبدارانہ اور آزادانہ سپرٹ میں قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اس کا صحیح طریقہ تو یہی ہے کہ قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس صورت میں سوال نامے کا پہلا سوال[1] بظاہر مسئلہ زیر بحث سے بے تعلق نظر آئے گا۔ لیکن بات یہ ہے کہ بعض حضرات نے قرآن و سنت سے قطع نظر کر کے اس بحث میں تاریخ سے مدد لی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ الربوٰا سے مراد ربوٰا کی صرف وہی صورتیں ہو سکتی ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت سامعین قرآن یعنی عربوں میں رائج تھیں۔ اور تجارتی قرضوں کا اس وقت (ان حضرات کے نزدیک) رواج ہی نہیں تھا بلکہ یہ دسویں صدی عیسوی سے رائج ہوئے ہیں اس لیے اُن کے

[1] سوال یہ تھا: عرب میں پیغمبرِ اسلام صلعم کے زمانہ میں قرضہ لینے دینے کی شکل کیا تھی؟

خیال میں کمرشل انٹرسٹ ربوٰا کی تعریف میں شامل نہیں ہوسکتا۔ اس طرح اس تاریخی بحث اور مسئلہ زیرِ بحث میں تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ پس پہلے سوال کا جواب دینے کے لیے ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مندرجہ بالا استدلال کے دونوں ہی مقدمات غلط ہیں۔ اس لیے لازم تھا کہ غلط نتیجے پر منتج ہوں۔

پہلے مقدمہ اولیٰ پر غور فرمایئے کہ الربوٰا سے وہی صورتیں مراد ہوسکتی ہیں جو نزول قرآن کے وقت عرب میں رائج اور عرب سامعین کے ذہن میں معہود تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معقولیت کا عام اور مسلم اصول ہے کہ لِکُلٍّ اَنْ یَّصْطَلِحَ (یعنی ہر شخص کو حق ہے کہ اپنے اظہارِ مطالب کے لیے حسب ضرورت اصطلاحات وضع یا مقرر کرے۔ اب ایک قائل بعض اوقات رائج اصطلاحات سے کام لیتا ہے۔ لیکن بعض اوقات وہ نئی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور کسی مروجہ لفظ کو ایک مخصوص مفہوم میں استعمال کرکے اسے اپنی مخصوص اصطلاح قرار دے لیتا ہے۔ ایسی صورت میں سامعین کے معہود ذہنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اصطلاح کے وضع کرنے والے کے معہود ذہنی کا سوال ہوتا ہے۔ جب ایک واضع قانون اپنی اصطلاح کی تعبیر خود کر دے تو پھر اس سیاق میں اس اصطلاح کو کسی اور معنی میں استعمال کرنا غلط ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں جملہ علوم کی اصطلاحات سے بے شمار دی جا سکتی ہیں لیکن محض قانونی اصطلاحات کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے۔ بالعموم ہر ایکٹ اپنے متن میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی تعریف ابتدا ہی میں کر دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوال ہی غیر متعلق اور غیر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اصطلاح اس قانون کے وضع ہونے سے پہلے بھی اس مفہوم میں مستعمل تھی یا نہیں۔ سامعین کے معہود ذہنی کی تفتیش کی ضرورت تو اس وقت ہوسکتی ہے جب واضع قانون نے اپنی اصطلاح کا مفہوم خود واضح نہ کر دیا ہو۔ الربوٰا کے متعلق خود قرآن پاک کی عبارت سے صراحتاً معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے کس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے اس کے علاوہ قرآن کے مخاطب اول جناب رسول مقبول صلعم نے بالصراحت و بالتفصیل بتا دیا کہ ربوٰا کے اصطلاحی معنی مراد خداوندی کے مطابق کیا ہیں اس کے بعد یہ سوال زائد از ضرورت اور خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت عربوں میں ربوٰا کی کیا کیا صورتیں رائج تھیں اور ربوٰا سے متعلق ان کا معہود ذہنی کیا تھا۔ اس سوال کی تفتیش کا نتیجہ کچھ بھی ہو اس کا احکامِ قرآنی کی نوعیت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

یہاں تک تو پہلے مقدمہ سے بحث تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں اس استدلال کا دوسرا

مقدمہ بھی سرتاسر غلط ہے کہ عربوں میں نزول قرآن کے وقت تجارتی قرضوں کا رواج ہی نہ تھا۔ یہ "تاریخی" دعویٰ بھی تاریخی حقائق سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں میں یہ رواج نزول قرآن کے وقت بھی تھا۔ اور بعد میں بھی برابر رہا۔ اس لیے اگر عربوں کے معہود ذہنی کو دیکھنا درست بھی ہو تب بھی تجارتی قرضوں کا سود ربوٰا کی تعریف سے باہر نہیں رہتا۔ تجارتی قرضے کے سود کو ربوٰا میں شامل نہیں سمجھنا چاہیئے تو بار ثبوت اس مدعی پر آپڑتا ہے کہ وہ دکھائے کہ باوجود تجارتی قرضوں کے رواج کے ان پر سود لینا جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین یا فقہائے اسلام علیہم الرحمۃ نے جائز قرار دیا اور اسے وہ ربوٰا کی تعریف میں داخل نہ جانتے تھے۔ بہر حال پہلے دن کی مجلس میں جب یہ دعویٰ سامنے آیا تو ہم نے تاریخی حیثیت سے اس کے غلط ہونے پر اصرار کیا، چنانچہ دسویں صدی سے پہلے اور خصوصاً نزول قرآن کے وقت عربوں میں تجارتی قرضوں کے رواج کا تاریخی ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری ہم پر ڈالی گئی۔

ایسے قرائن و شواہد کا تو شمار ہی نہیں جن سے ایک غیر جانبدار ذہن سوائے اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ عربوں میں نزول قرآن کیا اس سے بھی پہلے سے تجارتی قرضوں کا رواج موجود تھا لیکن گفتگو کی فضا سے ہمیں محسوس ہوا کہ قرائن شاید تسلی بخش ثابت نہ ہوں۔ ضرورت ایسی واضح اور معین مثالوں کی ہے جن کے بارے میں اصل ماخذ میں تصریح موجود ہو کہ قرضہ تجارتی اغراض کے لیے لیا یا دیا گیا۔ بعض مثالیں ذہن میں تھیں لیکن لفظی صراحت والی مثالوں کے لیے ماخذ کو کھنگالنے کی ضرورت تھی۔ خوش قسمتی سے ہمیں فضل الرحمٰن صاحب کا کمرشل انٹرسٹ کے موضوع پر ایک مقالہ (مطبوعہ اسلامک تھاٹ (ISLAMIC THOUGHT) علیگڈھ) دستیاب ہوا جس نے نہ صرف مثالوں کے انتخاب کے لیے اصل ماخذ کی طرف رجوع کی دقت سے ہمیں بچا لیا بلکہ ہند بنت عتبہ اور قاضی ابو یوسف ؒ کی دو بالکل نئی مثالیں بھی ہم کو دیں۔ اس سے بھی بڑھ کر متعلقہ اقتباسات و حوالہ جات بھی چھپے چھپائے ہمیں اس مقالے میں مل گئے۔ مندرجہ بالا سب مثالوں کے لیے ہم فضل الرحمٰن صاحب کے مقالے کے ممنون ہیں۔ صرف آخری مثال ڈاکٹر امام الدین صاحب کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے جو

اسلامک کلچر میں شائع ہوا تھا۔

ہم نے کہیں کہیں اپنے الگ حوالے بھی ذکر کیے ہیں لیکن اس سے مذکورہ مقالے سے ہمارے اخذ و اکتساب اور ہماری ممنونیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

ایک لحاظ سے تو صرف مذکورہ بالا مضمون کا حوالہ دے دینا کافی ہوتا۔ لیکن ایک تو ہم یہاں بات کو تشنہ نہیں چھوڑنا چاہتے دوسرے ہم بعض مثالوں کے مضمرات کا اپنے نقطۂ نظر سے تجزیہ کرنا چاہتے ہیں لہذا مختصراً مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔

تاریخی ترتیب سے سب سے پہلی مثال حضرت زبیر بن العوام کی ہمارے سامنے آتی ہے یہ مثال کئی حیثیت سے نہایت اہم ہے۔ ایک تو یہ خود آنحضرت صلعم کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے دوسرے حضرت زبیر ابن العوام کوئی غیر معروف شخصیت نہیں بلکہ محترم ترین صحابہ میں سے تھے۔ ایمان لانے میں چوتھے یا پانچویں نمبر پر ہیں۔ بڑے پائے کے تاجر تھے اور امانت و دیانت میں یہ شہرت رکھتے تھے کہ بڑی بڑی شخصیتیں اپنے اموال ان کے پاس حفاظت کے لیے رکھوا [illegible] [illegible] تجارتی قرضہ لینے دینے کی نہیں ہے بلکہ ان کے طریق کار کا بہ غور جائزہ لیا جائے تو ان کا طریقہ بالکل وہی طریقہ تھا جسے بینکرز کا طریقہ کہنا چاہیے۔ اس طریقہ کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے بینکنگ کی اساس کا سرسری سا مطالعہ کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

تجارت کے لیے قرضہ حاصل کرنے کی ہمیشہ انفرادی اور سادہ، واضح صورت ہی نہیں اختیار کی جاتی بلکہ ایک دوسری صورت قدرے زیادہ پیچیدہ اور غیر واضح بھی ہے جس پر بنکنگ کی عمارت قائم ہے بنک جانتے ہیں کہ بہت سے حضرات اپنے اموال بجائے اپنے پاس رکھنے کے ایسے اشخاص یا اداروں کے پاس رکھوانا زیادہ پسند کریں گے جن کے پاس حفاظت کے بہتر انتظامات موجود ہوں اور انہیں صرف یہ مطلوب ہے کہ جب اور جتنا جتنا روپیہ اپنی رقم میں سے چاہیں انہیں بلا چون و چرا کے مل جایا کرے۔ انہیں اس سے بحث نہیں کہ بنک ان کی رقم کو کس حیثیت میں اپنے پاس رکھتا ہے۔ لیکن

بنک اس قانونی باریکی کو دیکھتا ہے کہ اگر وہ لوگوں کا روپیہ ودیعت کے طور پر رکھے تو اسے بیکار رکھے رہنا پڑے گا۔ حالانکہ اگر وہ اسی روپے کو انہیں شرائط کے پورا کرنے کے وعدہ پر بطور قرض اپنے پاس رکھے تو وہ اس دوران میں جمع کرنے والوں کے روپے کے ایک کثیر حصے کو اپنی منشا کے مطابق اپنی تجارت یا سودی کاروبار میں لگانے کا مجاز ہوگا۔ اور جمع کرانے والوں کو بھی اس میں یہ فائدہ ہوگا کہ ان کا روپیہ بنک کے ذمے قرضے کے طور پر مضمون ہو جائے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ بنک میں روپیہ رکھنے والوں کی اکثریت اس نکتے سے واقف ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ بنک میں رکھا ہوا روپیہ بنک بطور قرض لیتا ہے اور آگے اسے اپنی تجارت یا کاروبار میں لگا دیتا ہے۔ چنانچہ بنہم (BENHEN) رقم طراز ہے:

"بنک میں رکھے ہوئے ڈیپازٹ کی مثال ایسی نہیں جیسے کوئی کلوک روم میں اپنا سامان بطور امانت رکھوا دے بلکہ یہ دراصل بنک کو دیے ہوئے قرضے ہوتے ہیں۔ جن کے متعلق بالعموم سب جانتے ہیں کہ بنک اس روپے کے کثیر حصے کو آگے قرض پر چلا دے گا۔" (BENHEN

(ECNOMIC P.363

بالکل اسی اصول پر جن کیے ہوئے تجارتی قرضے کی مثالیں تاریخ اسلام میں شروع ہی سے ملتی ہیں یا یوں کہیے کہ آغاز اسلام ہی سے ہمیں بینکرز انفرادی حیثیت سے لیکن بڑے اونچے پیمانے پر باقاعدہ مصروف بینک کاری نظر آتے ہیں۔ جن میں ایک مثال حضرت زبیر ابن العوامؓ کی ہے۔ حضرت زبیر کے پاس لوگوں کی رقمیں آتی رہتی تھیں اور لوگ اپنی رقموں کا جز یا کل وقتاً فوقتاً واپس بھی لیتے رہتے تھے۔ اس طرح اگر کسی وقت بھی حضرت زبیرؓ کو حفاظت کے لیے دی ہوئی رقموں کی میزان لگائی جاتی تو وہ ایک خطیر رقم تھی۔ یہ درحقیقت اس وقت ان کے ذمے قرضے کا کل ہوتا تھا جس سے وہ بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔ ان کے طریق کار کے متعلق ساری تفصیلات ہمیں اصل ماخذ میں بصراحت ملتی ہیں اور ہماری قیاس آرائی پر مبنی نہیں ہیں۔

(۱) یہ کہ جب کوئی شخص حضرت زبیر بن العوام کے پاس اپنا مال ودیعت کے طور پر رکھنے آتا تھا تو وہ اس رقم کو بطور ودیعت [illegible] قرض [illegible] منظور کرتے تھے [illegible]

ابن سعد میں صراحت ہے۔

"انما کان دینهُ الذی کان علیه انّ الرجل کان یاتیه بالمال یستودعهٔ ایّاهُ فیقول الزبیر لا ولکن هو سلف۔ انی اخشی علیه الضیعة"

فضل الرحمٰن صاحب نے یہی عبارت بخاری کے حوالے سے دی ہے اور فتح الباری سے اس کی تشریح میں مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے جس سے یہ تفصیل مل جاتی ہے کہ حضرت زبیر ایسا کیوں کرتے تھے :۔

ای ما کان یقبضُ من احدٍ ودیعتهٗ الّا ان رضِیَ صاحبُها ان یجعلها فی ذمّتہٖ وکان غرضهٗ بذالك انّهٗ کان یخشیٰ علی المال ان یضیع فیظنّ به التقصیر فی حفظهٖ ۔ فرای ان یجعلهٗ مضموناً فیکون اوثق لصاحب المال وابقیٰ لمروتهٖ ۔ وزاد ابن بطال "ولیطیب لهٗ ربح ذالك المال"

یعنی حضرت زبیر کسی کی ودیعت اس وقت تک نہیں لیتے تھے جب تک وہ اس رقم کو ان کے ذمے قرض قرار دینے پر راضی نہ ہو جائے اور اس سے ان کی غرض یہ ہوتی تھی کہ انہیں یہ ڈر رہے کہ مال ضائع ہو جائے اور ان پر حفاظت میں کوتاہی کا گمان کیا جائے۔ اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح اسے مضمون (محفوظ) کر دیں کیونکہ یہ صاحبِ مال کے لیے بھی بہتر ہوگا اور خود اُن کی مروت (اور ساکھ) کے لیے بھی زیادہ باعث پائیداری" اور ابن بطال نے اس پر یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ "وہ ایسا اس لیے بھی کرتے تھے کہ اس مال سے تجارت کرنا اور فائدہ کمانا ان کے لیے جائز ہو جائے"۔

(۳) حضرت زبیرؓ اس طریقے سے کتنی بڑی بڑی رقمیں بطور قرض اپنے پاس ڈیپازٹ کرتے تھے اس کا اندازہ بھی طبقات ابن سعد میں دی ہوئی رقموں سے ہوتا ہے۔ ان کے انتقال کے وقت حساب کیا گیا تو ان کے ذمے ۲۲،۰۰،۰۰۰ کی رقم قرض تھی۔

"قال عبد اللّٰہ ابن الزبیر فحسبتُ ما علیه من الدین فوجدتهٗ الفی الف ومأتی الف"

یعنی "عبداللہ ابن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے حساب کیا کہ ان پر (حضرت زبیرؓ) کتنا قرض ہے تو یہ رقم بائیس لاکھ نکلی"۔

(۴) یہ تمام سرمایہ تجارت میں لگا ہوا تھا۔ کیونکہ انتقال سے پہلے حضرت زبیرؓ نے اپنے فرزند عبداللہ ابن زبیر کو ہدایت کی کہ ہماری املاک کو فروخت کرکے یہ تمام قرض ادا کیا جائے اور یہ انہی رقموں کی میزان تھی جو لوگ ان کے پاس بطور ودایع کے لاتے تھے لیکن وہ بطور قرض برائے تجارت قبول کرتے تھے۔ ابن سعد نے یوم جمل کی ساری گفتگو مابین حضرت زبیرؓ و عبداللہ ابن زبیر دی ہے جس سے ساری بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔ ہم طوالت کے خوف سے اصل عبارت نقل نہیں کرتے۔ تجارت کے لیے نیک کارانہ طریقے پر فراہم کیے ہوئے قرضوں کی یہ واحد مثال نہیں ہے بلکہ یہ طریقہ بعد میں بھی قائم رہا اور تاریخ میں اس کی مثالیں بالوضاحت ملتی ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی مثال آگے آتی ہے۔ فی الحال ہم زمانی ترتیب کے لحاظ سے حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(۲) طبری نے ۲۳ھ کے واقعات میں ہند بنت عُتْبَہ کا واقعہ لکھا ہے کہ:

ان هند بنت عتبة قامت الى عُمَر بن الخطّاب فاستقرضته من بيت المال اربعة آلاف تتجر فيها وتضمنها فاقرضها فخرجت الى بلاد كلب فاشترت وباعت فلما اتت المدينة وباعت شكت الضيعة فقال لها عمرؓ لو كان مالي لتركته، ولكنه مال المسلمين۔

ترجمہ: ہند بنت عتبہ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آئی اور مناسب ضمانت پر بیت المال سے چار ہزار کی رقم قرض مانگی تاکہ وہ اس سے تجارت کر سکے۔ چنانچہ اسے یہ قرض دیا گیا اور وہ بلاد کلب میں گئی اور مال خریدا اور بیچا اور جب مدینے میں آئی اور مال بیچا تو شکایت کی کہ اسے نقصان ہوا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر یہ میرا روپیہ ہوتا تو میں چھوڑ دیتا لیکن یہ تو مسلمانوں کا مال ہے۔"

(تاریخ طبری بحوالہ فضل الرحمٰن صاحب)

خاص طور پر نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ تصریح اصل عربی عبارت میں صراحتاً موجود

ہے کہ قرض تجارت کے لیے مانگا اور دیا گیا اور واقعتہً ہند بنت عتبہ نے اس رقم سے تجارت ہی کی

(۳) تیسری مثال بھی حضرت عمرؓ کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے اور بیت المال ہی سے تجارت کے لیے روپیہ قرض دینے کا واقعہ ہے۔

موطا امام مالکؒ میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادگان حضرت عبداللہ اور حضرت عبیداللہ ایک لشکر کے ساتھ عراق گئے۔ لوٹتے وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری سے ملنے گئے تو انہوں نے خیر مقدم کیا اور کہا کہ اگر میرے امکان میں کوئی ایسی بات ہو کہ آپ کو نفع پہنچا سکوں تو ضرور کروں گا۔ پھر خود ہی کہا ہاں کیوں نہیں میرے پاس بیت المال کی ایک رقم ہے جو میں امیرالمومنین کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں وہ میں آپ کو قرض دے دیتا ہوں۔ آپ اس سے تجارت کا مال عراق سے خرید یں اور اس کو جا کر بیچیں اور اصل رقم امیرالمومنین کو پہنچا دیں اور منافع خود رکھ لیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور حضرت عمرؓ کو اطلاع دے دی گئی کہ اتنی رقم ان سے لے لیں۔ پس جب وہ آئے اور سامان بیچا اور نفع کمایا اور اصل رقم حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کی تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا تمہاری طرح لشکر کے دوسرے لوگوں کو بھی قرض دیا گیا؟ ہر دو صاحبزادگان نے کہا کہ نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہاں تم دونوں امیرالمومنین کے بیٹے ہو نا اس لیے تمہیں قرض دیا گیا پس اصل رقم اور اس سے جو نفع کمایا ہے دونوں داخل کرو۔ حضرت عبداللہ خاموش رہے مگر حضرت عبیداللہ نے کہا امیرالمومنین آپ کو ایسا نہیں چاہیے۔ کیا اگر یہ رقم ضائع ہو جاتی یا نقصان ہو جاتا تو پوری رقم ہم سے نہ وصول کر لی جاتی اور ہم اس کے ضامن نہیں تھے؟ حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ بس ادا کرو۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ امیرالمومنین اس معاملے کو قراض (مضاربت) ہی تصور کر لیجیے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اچھا قراض مانے لیتے ہیں اور اصل کے علاوہ منافع کا بھی نصف وصول کر لیا اور منافع کا باقی نصف حضرت عبداللہ اور حضرت عبیداللہ نے لے لیا۔

مندرجۂ بالا واقعہ سے ظاہر ہے کہ روپیہ اصل میں بطور تجارتی قرض ہی کے دیا گیا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے مصلحتاً اسے قراض قرار دیا۔

یہاں یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ بعض صورتوں میں تجارت کے لیے روپیہ قرض لینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دینے والا دے تو دیتا ہے مگر محض قرض کے طور پر نہیں دینا چاہتا اور معاملہ منافعِ تجارت میں حصہ داری پر طے پاتا ہے۔ شاید اس مخصوص شکل کو ظاہر کرنے کے لیے قراض کی اصطلاح وضع کی گئی جو مضاربت کے ہم معنی مستعمل ہے لیکن آپ یہ فرق واقعات ملحوظ رکھیں کہ ضرورت قرض کی پیش آئی لیکن معاملہ مضاربت پر طے پایا۔ یہ صورتِ واقعات اُن حالات سے یقیناً مختلف ہے کہ ایک صاحبِ مال دوسرے تاجر (جو ضروری نہیں کہ حاجتمند ہو) کے ساتھ منافع کی حصہ داری کی اساس پر تجارت میں شریک ہو۔ چنانچہ مندرجۂ بالا واقعہ امام مالک نے باب القراض ہی میں ذکر کیا ہے[1]۔

[1] معلوم ہوا کہ سیمینار کے انعقاد کے بعد بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "مؤطا امام مالکؒ کا حوالہ ہم نے غلط دیا ہے کیونکہ مؤطا میں ایسا کوئی واقعہ مذکور نہیں"۔ ہمیں اس قول پر حیرت ہے۔ بہرحال یہ تصریح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پیشِ نظر مؤطا کا وہ ایڈیشن تھا جو کتب خانہ رحیمیہ دہلی کا شائع کردہ ہے اور جس میں مؤطا مع ہر دو شرح یعنی مصفّٰی و مسوّٰی مصنفہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ چھپی ہے۔ اس نسخے میں روایت کا ایک ٹکڑا متن میں دیا گیا ہے اور پورا واقعہ نوٹ میں دیا گیا ہے۔ مبادا کسی کو غلط فہمی ہو کہ نوٹ شاہ ولی اللہ صاحب کا ہے اور اس طرح تمام روایت کا انتساب مؤطا سے غلط ہے تو یہ گزارش ہے کہ اس سارے واقعے کو اربابِ علم ہمیشہ مؤطا ہی سے منسوب کرتے رہے ہیں اور راقم الحروف اس حوالے میں اکیلا نہیں۔ مثلاً امام زیلعی نصب الرایہ میں فرماتے ہیں (جلد چہارم۔ کتاب المضاربت):۔

قوله وروی ان الصحابة تعاملوا بها۔ قلت روی مالک فی الموطا عن زید بن اسلم عن ابیه ان عبد الله وعبید الله ابنی عمر بن الخطاب خرجا الی العراق فاعطهما ابوموسیٰ

(۴) اسی طرح حضرت عثمان کے یعقوب کو قراض پر روپیہ دینے کا ذکر ملتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا تذکرہ جو ہماری نظر سے گزرا موطا امام مالکؒ میں ہے۔ پھر ابن سعد نے بھی طبقات میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن فضل الرحمٰن نے اپنے مضمون میں بیہقی کے حوالے سے زیادہ تفصیل دی ہے۔ ہم وہیں سے نقل کرتے ہیں۔

علاء ابن عبدالرحمٰن بن یعقوب سے روایت ہے کہ ان کے دادا حضرت عثمان کے پاس گئے اور کہا کہ اس کا مال تجارت آگیا ہے اور اسے روپے کی ضرورت ہے اور استدعا کی کہ اسے قرض دے دیں تاکہ وہ مال خرید کر بیچے۔ حضرت عثمان نے کہا کہ اگر واقعۃً ضروری ہے تو میں رقم دے دیتا ہوں لیکن یعقوب کے مکاتب ہونے کے باعث اس نے استدعا کی کہ معاملہ منافع میں نصف نصف شرکت کی صورت میں کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عثمان نے اس پر اتفاق کر کے رقم دے دی۔

یہاں بھی معاملہ کی وہی نوعیت ہے کہ قرض کی ضرورت سے شروع ہوا اور مضاربت کی صورت میں طے کیا گیا۔ بیہقی نے بھی اسے کتاب القراض ہی میں نقل کیا ہے۔

(۵) اس کے بعد ہم حضرت امام ابوحنیفہ کی مثال پر آتے ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تجارت جس پیمانے پر چلتی تھی اس کی تفصیلات تاریخ میں موجود ہیں۔ دوسری طرف ان کے پاس بطور ودیعت کے کتنا مال آتا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف نیل کے ایک تاجر نے آپ کے پاس ایک لاکھ ستر ہزار درہم رکھوائے تھے۔ (مناقب النعمان)

مناقب النعمان کی مندرجہ ذیل عبارت اور ملاحظہ ہو: قال سفیان ابن وکیع بن

۴- من مال اللہ علی ان یبتاعا بہ متاعاً و یبیعانہ بالمدینۃ و یؤدیا راس المال لامیرالمومنین والربح لہما فلما قدما المدینۃ ربحا فقال عمر أکل الجیش اسلفہ کما اسلفکما؟ قالا لا فقال ابنا امیرالمؤمنین فاسلفکما ادیا المال و ربحہ فراجعہ عبید اللہ وقال ما ینبغی ھذا یا امیرالمومنین لو ھلک المال او نقص لضمناہ فقال لہ بعض جلسائہ لو جعلتہ قراضاً فاخذ عمر المال و نصف ربحہ و اعطاھما النصف۔

الجراح قال ابی کان ابوحنیفة عظیم الامانة ومات ابوحنیفة وفی بیته خمسون الف الف" یعنی سفیان ابن وکیع ابن الجراح نے کہا میرے والد بتاتے ہیں کہ ابو حنیفہ عظیم الامانت تھے اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے گھر میں ۵ کروڑ کی رقم تھی۔

(۶) قاضی امام ابو یوسف ؒ کی مثال بھی بالکل واضح ہے۔ فقہ اسلامی نے یتامیٰ کے اموال کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ گنجائش رکھی ہے کہ قاضی یتامیٰ کے مال کو قرض دے دے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے:

ویقرض القاضی اموال الیتامیٰ — قاضی کو چاہیے کہ یتامیٰ کے اموال کو قرض دے دے۔

اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

لان فی الاقراض مصلحتہم لبقاء الاموال محفوظة مضمونة۔ — یہ اس لیے کہ ان کے مال کو قرض پر دے کر محفوظ و مضمون کر دینے میں ان کے مال کی بقا کے لیے مصلحت ہے۔

پھر یہ تصریح بھی موجود ہے کہ اگر قرض مانگنے والا ابتداہی میں نادار و مفلس ہو تو اسے مالِ یتامیٰ قرض پر نہ دیا جائے:۔

ولوکان المستقرض معسراً فی الابتداء لا یجوزان یقرضہ مال الیتیم۔

قاضی ابو یوسف کے متعلق ان کے حالات میں ذکر ملتا ہے کہ وہ یتامیٰ کے اموال جو بحیثیت قاضی ان کی تحویل میں رہتے تھے مضاربت پر دے دیتے تھے اور اس کا منافع اپنے لیے رکھ لیتے تھے۔ خطیب بغدادی نے ان کے حال میں یہ فقرہ معترضانہ انداز میں لکھا ہے کہ: انہ کان یعطی اموال الیتامیٰ مضاربة ویجعل الربح لنفسہ۔ لیکن جو فقہ کے مندرجہ بالا مسئلہ کو سمجھتا ہے وہ حقیقتِ حال کو فوراً سمجھ لیگا کہ اس میں امام ابو یوسف کسی قابلِ اعتراض بات کے مرتکب نہیں تھے۔ وہ یتامیٰ کے مال کو خزانۂ قضا سے اپنی ذاتی حیثیت سے قرض لے لیتے تھے اور اس کو آگے مضاربت پر تجارت میں لگا دیتے تھے جس کا نفع وہ

خود لینے کے اخلاقاً و قانوناً حقدار تھے۔ یہ بھی تجارتی قرض کی واضح مثال ہے۔

(۷) اسی طرح ڈاکٹر امام دین نے اپنے ایک مضمون میں رائی بیرا RIBERA کے حوالہ سے تیسری صدی ہجری کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ قاضی سلیمان بن اسود نے حبیب احمد محمد بن زیاد اللخمی کو پانچ ہزار دینار تجارت میں لگانے کے لیے قرض دیئے (مضمون ڈاکٹر امام الدین صاحب مطبوعہ اسلامک کلچر جنوری ۱۹۶۰ء)

پہلے سوال کا فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں امید ہے یہ مثالیں کافی ہونگی اور اس میں شک نہ رہ گیا ہوگا کہ دسویں صدی سے بہت پہلے آغاز اسلام ہی سے عربوں میں تجارتی قرضے رائج تھے اس لیے تجارتی قرضوں کے سود کو کسی صورت بھی الربٰو کی تعریف سے باہر نہیں رکھا جا سکتا۔ جو لوگ یورپ کے کسی مصنف کے اس دعوے پر یقین کر بیٹھے ہیں کہ دسویں صدی سے پہلے تجارتی قرضوں کا کہیں رواج نہ تھا وہ ایک بے سروپا دعوے پر بلا تنقید ایمان لے آئے ہیں محض اس لیے کہ وہ ایک یورپی مصنف کا قول ہے۔

(باقی)